محمد اسحاق بھٹی

مولانا محی الدین احمد قصوری

پنجاب کے جن مذہبی اور علمی خاندانوں نے سیاسیات میں بھرپور حصہ لیا اور آزادی وطن کی تحریکوں میں خدمات سرانجام دینے کی بنا پر انگریزی حکومت کے مظالم کا شکار ہوئے ان میں قصوری خاندان کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، جس کے ایک رکن مولانا عبدالقادر قصوری تھے۔ مولانا عبدالقادر کے ایک بیٹے کا اسم گرامی مولانا محی الدین احمد قصوری تھا۔ ان سطور میں انہی کے بارے میں چند باتیں بیان کرنا مقصود ہے، لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے چند الفاظ میں ان کے خاندانی پس منظر کا ذکر کیا جائے۔

اس خاندان کے ایک بزرگ مولوی غلام احمد تھے، جو ضلع گوجرانوالہ کی تحصیل وزیر آباد کے ایک گاؤں "دلاور چیمہ" کے رہنے والے تھے۔ بیس اکیس ایکڑ وہاں ان کی زمین تھی اور پیشے کے اعتبار سے وہ مدرس تھے۔ نہایت نیک اور پرہیزگار آدمی تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۱ء میں "دلاور چیمہ" میں وفات پائی۔

ضلع گوجرانوالہ کے ایک قصبے قلعہ میہاں سنگھ میں ایک صاحب تقویٰ عالم مولانا غلام رسول اقامت گزیں تھے، مولوی غلام احمد سے ان کا دوستانہ تھا اور دونوں کی ایک دوسرے کے ہاں آمد و رفت تھی۔

مولوی غلام احمد کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے عبدالقادر، ان سے چھوٹے عبدالحق اور سب سے چھوٹے عبداللہ۔ تینوں دینی اور دنیوی تعلیم سے آراستہ اور زمانے کے تیوروں سے آشنا تھے۔

عبدالقادر ۱۸٦۳ء کے لگ بھگ دلاور چیمہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا آغاز کیا تو بسم

اللہ مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ والا) سے کرائی۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی، بعض دینی علوم بھی اسی نواح کے اساتذہ سے پڑھے۔ اس کے بعد اورنٹیل کالج لاہور میں داخل ہوئے اور عربی و فارسی کے امتحانات میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ لیکن ممتحن کو ان کی کامیابی پر یقین نہ آیا تو دوبارہ پرچے حل کرنے کے لیے کہا گیا۔ اب پھر اسی معیار پر پورے اترے تو انھیں وظیفہ دیا گیا، لیکن وظیفے کی رقم انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی مولوی عبدالحق کی تعلیم کے لیے مختص کر دی۔ مولوی عبدالحق نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور عرصہ دراز تک گوجرانوالہ میں وکالت کرتے رہے۔

عبداللہ نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور مولانا عبداللہ قصوری کے نام سے شہرت پائی۔ مولانا عبداللہ اپنے عہد کے بہت بڑے مبلغ اسلام تھے۔ انھوں نے اپنے بھتیجے مولانا محی الدین احمد قصوری کے ساتھ مل کر "جمعیت دعوت و تبلیغ" کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی۔ غیر مسلموں میں وہ نہایت موثر طریقے سے اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس موضوع پر انھوں نے چھوٹی بڑی چند کتابیں بھی تصنیف کیں جو جمعیت دعوت و تبلیغ کی طرف سے معرضِ اشاعت میں آئیں۔

۱۹۳۵ء میں جب ہندوستان کے مشہور اچھوت لیڈر ڈاکٹر بھیم راؤ رام جی امبید کر (۱۸۹۱ء - ۱۹۵۶ء) نے اچھوتوں کے لیے تبدیلیٔ مذہب کا اعلان کیا تھا اور اشارہ دیا تھا کہ وہ اسلام قبول کرنے پر غور کر رہے ہیں، اس وقت لاہور کے معروف نو مسلم قانون دان خالد لطیف گابا کو علامہ اقبال نے مشورہ دیا تھا کہ وہ (یعنی خالد لطیف گابا) اور مولانا عبداللہ قصوری فوراً بمبئی روانہ ہو جائیں اور وہاں کی ان اسلامی تنظیموں سے رابطہ پیدا کریں جو اچھوتوں میں اشاعت اسلام کے لیے کوشاں ہیں۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام کے متعلق مولانا عبداللہ قصوری کا انداز بڑا مدلل اور پُر تاثیر تھا۔ انھوں نے آزادی وطن سے چند سال پہلے وفات پائی۔

اب آئیے مولانا عبدالقادر کے بارے میں چند باتیں بیان کرتے ہیں جو مولوی غلام احمد کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔

مولانا عبدالقادر نے اورنٹیل کالج سے فارغ ہو کر وکالت کا امتحان پاس کیا اور پھر وکالت ہی کو اپنا پیشہ بنالیا۔ وہ گوجرانوالہ میں وکالت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مقدمے کے سلسلے میں جس کی فیس ان کو پانچ روپے دی گئی تھی، قصور کے تحصیل دار کی عدالت میں پیش ہوئے۔ جس انداز میں انھوں نے اپنا مقدمہ پیش کیا اور جس اسلوب میں اپنے مؤکل کے حق میں دلائل دیئے، اس سے تحصیل دار بہت متاثر ہوا۔ اس نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ قصور آجائیں اور یہیں وکالت کریں، یہاں انھیں اپنے پیشے میں ترقی کے زیادہ مواقع میسر آئیں گے۔ چنانچہ وہ قصور چلے گئے اور اسی شہر کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اس کے بعد وہ مولانا عبدالقادر قصوری کے نام سے مشہور ہوئے۔

۱۸۹۰ کے پس و پیش وہ قصور گئے تھے۔ قصور میں ان کی وکالت خوب چمکی۔ وہ دیوانی اور فوجداری قانون میں یکساں مہارت رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ فیس ادا کر کے اپنے مقدمات کے سلسلے میں انھیں دوسرے ضلعوں میں بھی لے جاتے تھے۔ وہ پہلے مقدمے میں پانچ روپے فیس لے کر قصور گئے تھے اور پھر تھوڑے ہی عرصے کے بعد ان کا شمار قصور کے رؤسا و امرا میں ہونے لگا تھا۔

مولانا عبدالقادر قصوری بہت سے اوصاف و محاسن کے حامل تھے۔ عالم باعمل، تقویٰ شعار، فیاض اور ایثار پیشہ، معاملہ فہم اور منکسر مزاج۔ میں نے ان کو ۱۹۳۹ء میں دیکھا تھا۔ پورا قد، گورے چٹے، صاف ستھرا لباس، سفید داڑھی، بڑا سر، ٹھہر ٹھہر کر نہایت آرام سے باتیں کرتے تھے۔ حلم و متانت کا پیکر پُر خلوص، نیکی اور دین داری کے آثار ان کے چہرے پر نمایاں تھے۔

ان کا دور سیاسیات کا دور تھا اور انگریزی حکومت کے خلاف ملک میں کئی تحریکیں چل رہی تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ ان کے تعلقات قائم ہو گئے تھے، جن میں بہت جلد

پختگی اور گہرائی پیدا ہو گئی تھی۔ مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ میں کلکتے سے ہفت روزہ "الہلال" جاری کیا تو مولانا عبدالقادر نے ان کی بڑی مدد کی۔

قصور میں ان کا مکان تین وجوہ سے لوگوں کا مرکز قرار پا گیا تھا۔

۱- وہ نیک اور صالح بزرگ تھے اور لوگ ان کی خدمت میں حاضری کو اپنے لیے سعادت قرار دیتے تھے۔

۲- وہ اپنے عہد کے بہت بڑے وکیل تھے اور لوگ اپنے مقدمات کے سلسلے میں ان کے پاس آتے تھے۔

۳- وہ ملکی سیاسیات سے تعلق رکھتے اور اس میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔ سیاست سے منسلک لوگ کثیر تعداد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

انھوں نے خلافت تحریک میں بہت کام کیا اور اپنے جذبۂ خلوص کی بنا پر پورے ہندوستان میں شہرت پائی۔ ہندو، مسلمان اور سکھ لیڈر ان کا نہایت احترام کرتے تھے اور انتہائی ادب کے ساتھ ان سے ہم کلام ہوتے تھے۔ ملک کی سیاسی جماعتوں کے بڑے بڑے رہنما ان کے مشوروں کے منتظر رہتے تھے اور ان سے بے حد تکریم سے پیش آتے تھے۔ گاندھی جی بھی ان کے سامنے سر جھکا کر بیٹھتے تھے۔

سعودی عرب کے موجودہ حکمران شاہ فہد کے والد گرامی سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمان آل سعود نے ۱۹۲۴ء میں نجد و حجاز پر قبضے کے بعد مقابر و آثار کے انہدام کا سلسلہ شروع کیا تو آل انڈیا مجلسِ خلافت کا ایک بہت بڑا گروہ جو مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی وغیرہ اکابر پر مشتمل تھا، سلطان عبدالعزیز کی شدید مخالفت کرنے لگا تھا، لیکن مجلس خلافت کا دوسرا گروہ جس میں مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا داؤد غزنوی وغیرہ شامل تھے، سلطان کا حامی تھا۔

سلطان کے حامیوں میں اگرچہ سید سلیمان ندوی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی وغیرہ حضرات بھی شامل تھے جو یوپی یا دہلی وغیرہ علاقوں کے رہنے والے تھے، لیکن

مولانا محمد علی جوہر کے نزدیک سلطان کے زیادہ تر حامی پنجاب سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے وہ انھیں "پنجابی ٹولی" کہا کرتے تھے۔ پنجابی ٹولی کے ارکان میں سے وہ سب سے زیادہ مخالف مولانا عبدالقادر قصوری کے تھے۔ ۱۹۲۴، ۱۹۲۵ اور ۱۹۲۶ء کے زمانے میں "پنجابی ٹولی" کی اصطلاح ہندوستان میں بہت مشہور ہوئی تھی۔

برصغیر کی سیاست کا وہ عجیب و غریب دور تھا جو اب سیاسی تاریخ کا ایک حصہ قرار پا گیا ہے اور اس کی باتیں بطور واقعہ کے بیان کی جاتی ہیں۔

۱۹۲۴ء میں آل انڈیا مجلسِ خلافت کا ایک سہ رکنی وفد سلطان عبدالعزیز سے ملاقات کے لیے عازم حجاز ہوا تھا۔ اس وفد کا مقصد ارضِ حجاز کے مختلف مسائل سے متعلق سلطان سے گفتگو کرنا تھا۔

وفد کے ایک رکن مولانا عبدالماجد بدایونی تھے، جنھوں نے ۱۴۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو وفات پائی۔

دوسرے رکن مولانا عبدالقادر قصوری تھے جو نومبر ۱۹۴۲ء کو فوت ہوئے۔

تیسرے رکن سید سلیمان ندوی تھے جن کا انتقال ۲۳۔ نومبر ۱۹۵۳ء کو ہوا۔

اس وقت حالات نہایت خطرناک تھے، اس لیے یہ وفد صرف جدے تک جا سکا تھا۔ اس کے بعد یہ تینوں حضرات مثلاً سوڈان اور مصر وغیرہ ملکوں میں گئے اور واپس ہندوستان آ گئے۔

۱۹۲۶ء میں مکہ مکرمہ میں مؤتمر کا اجلاس ہوا، مولانا عبدالقادر قصوری اس اجلاس میں سلطان عبدالعزیز کی خاص دعوت پر شریک ہوئے تھے۔ سلطان ان کا بہت احترام کرتا تھا اور ان کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔

انھوں نے خلافت کے علاوہ ترکِ موالات، جہاد، مسئلہ حجاز اور ہجرت وغیرہ تحریکوں میں قائدانہ حیثیت سے حصہ لیا۔ وہ اس عہد کے کامیاب وکیل تھے، لیکن ترکِ موالات کی تحریک میں انھوں نے وکالت ترک کر دی تھی۔

۲۰- جولائی ۱۹۳۵ء کو مسجد شہید گنج کے سلسلے میں انگریزی حکومت نے مسلمانوں پر گولی چلادی تھی، جس کے نتیجے میں بے شمار مسلمان شہید ہو گئے تھے۔ اس مسئلے پر سکھوں اور مسلمانوں میں بہت زیادہ کشیدگی کے آثار ابھر آئے تھے اور صورتِ حال انتہائی پیچیدہ ہو گئی تھی۔ اس خطرناک اور مشکل ترین مسئلے کو سلجھانے کے لیے جن حضرات نے بھاگ دوڑ کی ان میں مولانا عبدالقادر قصوری پیش پیش تھے۔

۱۲- مئی ۱۹۳۶ء کو میاں عبدالعزیز مالواڈہ کے مکان پر مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تھا، اس میں میاں صاحب کے علاوہ قائد اعظم محمد علی جناح، نواب زادہ لیاقت علی خان، علامہ اقبال، ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین، غلام رسول بیرسٹر اور اس عصر کے بعض دیگر رہنما شامل تھے۔ اس اجلاس میں ایک پارلیمانی بورڈ تشکیل دیا گیا تھا۔ اس بورڈ میں علامہ اقبال، شیخ حسام الدین، مولانا عبدالقادر قصوری، چوہدری افضل حق، ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین اور میاں عبدالعزیز مالواڈہ شریک تھے۔

مولانا عبدالقادر قصوری کی فیاضی اور سخاوت و ایثار کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ مولانا آزاد کی تحریک "الہلال" سے انھیں بے حد دلچسپی تھی اور اس ضمن میں انھوں نے بڑی فیاضی کا ثبوت دیا۔ ۱۹۲۰ء کے بعد ایک مرتبہ چالیس ہزار روپے کی خطیر رقم اپنے چھوٹے بھائی مولانا عبداللہ قصوری اور بیٹے مولانا محی الدین احمد قصوری کے ہاتھ مولانا آزاد کو بھیجی۔ مولانا آزاد اس وقت دہلی میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی کوٹھی پر قیام فرما تھے اور یہ دونوں حضرات وہیں یہ رقم لے کر گئے تھے۔

مولانا عبدالقادر وفات سے چند سال پیشتر سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ انھوں نے جس آخری سیاسی جلسے میں شرکت کی، مناسب ہو گا کہ اس کا بھی یہاں ذکر کر دیا جائے۔

مارچ ۱۹۴۲ء میں لاہور میں جمعیت علمائے ہند کے سالانہ جلسے کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ صدرِ جلسہ مولانا سید حسین احمد مدنی تھے۔ جلسہ چوں کہ پنجاب میں منعقد ہو رہا تھا، اس لیے

مجلسِ استقبالیہ کی صدارت و نظامت پنجاب ہی کے دو حضرات کے سپرد ہونی چاہیے تھی۔ چنانچہ صدر استقبالیہ مولانا احمد علی کو اور ناظم مولانا سید داؤد غزنوی کو منتخب کیا گیا۔

اس زمانے میں مولانا عبید اللہ سندھی لاہور میں مولانا احمد علی کے ہاں قیام فرما تھے۔ انھوں نے مولانا احمد علی کو مجلس استقبالیہ کی صدارت قبول کرنے سے سختی کے ساتھ روک دیا تھا۔ کیوں روک دیا تھا؟

اس دور میں اس کی کئی وجہیں بیان کی جاتی تھیں، جس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔

مولانا احمد علی کی جگہ مولانا عبدالقادر قصوری کو صدرِ استقبالیہ بنایا گیا تھا۔ وہ بیمار تھے اور بیماری کی وجہ سے یہ منصب قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے، بڑی مشکل سے انھیں آمادہ کیا گیا تھا۔

جلسے کا آغاز ہوا تو مولانا عبدالقادر نے کھڑے ہو کر خطبۂ استقبالیہ کے چند الفاظ پڑھے اور پھر بیٹھ گئے۔ ان کا خطبہ ان کے صاحب زادے مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب نے پڑھا تھا۔

مولانا عبدالقادر قصوری کی زندگی کا یہ آخری اجلاس تھا جس میں وہ شامل ہوئے اور جمعیت علمائے ہند کا بھی یہ آخری جلسہ تھا جو پنجاب میں منعقد ہوا۔

مولانا موصوف عربی کے عالم، دینیات کے فاضل اور انگریزی میں دسترس رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے دو صاحب زادوں (مولانا محی الدین اور محمد علی) کو دینی علوم کی تعلیم بھی دلائی اور انگریزی تعلیم سے بھی آراستہ کیا، یعنی وہ قدیم و جدید دونوں کے شناور ہوئے۔ دونوں کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کے حوالے کر دیا اور اس کے لیے دل کھول کر روپیہ بھی خرچ کیا۔ کسی زمانے میں ان کی دعوتِ دین اور تبلیغ اسلام کا سلسلہ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں ”بمبئی سے لے کر مدراس تک جال کی طرح پھیلا تھا۔“

مولانا عبدالقادر امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی تصانیف کے دلدادہ تھے اور ان کے

افکار سے بہت متاثر تھے۔ سیاسی اور علمی حلقوں میں اس نوع کا ہمہ اوصاف آدمی پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔

انھوں نے نومبر ۱۹۴۲ء کو لاہور میں وفات پائی اور قصور میں دفن کیے گئے۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کی قربانیوں سے برصغیر کے کروڑوں باشندوں نے غیر ملکی اقتدار سے نجات حاصل کی اور جن کی سرگرمیوں سے یہ خطۂ ارض آزادی و حریت سے ہم کنار ہوا۔ یہ ہماری بدقسمتی اور حرماں نصیبی ہے کہ ہم اپنے ان محسنوں کو بھولتے جا رہے ہیں۔

مولانا عبدالقادر قصوری کے چار بیٹے تھے۔ سب سے بڑے احمد علی، ان سے چھوٹے برکت علی، ان سے چھوٹے محمد علی اور سب سے چھوٹے محمود علی۔ آئندہ سطور میں برکت علی کے بارے میں چند باتیں بیان کی جائیں گی۔

برکت علی اپریل ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی۔ میٹرک پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ۱۹۱۱ء میں بی اے کی سند حاصل کی۔ دینیات کی تعلیم اپنے والد بزرگ وار مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا فضل حق، مولانا اسماعیل دلاوری اور مولانا عبدالرحمان سے حاصل کی۔ حصولِ تعلیم کے بعد گوجرانوالہ کے محبوب عالم اسلامیہ ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ دو سال اس منصب پر فائز رہے۔ پھر اس منصب سے علیحدہ ہو گئے---- علیحدگی کا بھی عجیب قصہ ہے۔

اس وقت جنگ بلقان شروع تھی۔ ایک مرتبہ گوجرانوالہ میں انجمن اسلامیہ کا اجلاس ہوا، اس میں برکت علی بھی شامل تھے۔ انجمن کے کسی رکن نے لوگوں سے اپیل کی کہ دعا کرو، اللہ تعالیٰ بلقان میں سرکار انگلشیہ کو فتح سے نوازے۔

برکت علی نے کھڑے ہو کر کہا: ہر گز نہیں! انگریزی حکومت مسلمانوں کی دشمن ہے اور وہاں اس کی فوجیں مسلمانوں کو قتل کر رہی ہیں۔ ہم اس کے لیے کبھی فتح کی دعا نہیں مانگ سکتے۔ ہم چاہتے ہیں، انگریزوں کو شکست اور مسلمانوں کو فتح ہو۔

گوجرانوالہ کا ڈپٹی کمشنر انگریز تھا، اس کو پتا چلا تو اس نے اسی وقت ان کو ضلع کی حدود

سے باہر نکل جانے کا حکم دے دیا اور وہ قصور چلے گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۲ء میں کلکتے سے ہفت روزہ "الہلال" جاری کیا، جس کا پہلا شمارہ اس سال کی ۱۳۔ جولائی کو شائع ہوا۔ قصوری خاندان کو مولانا آزاد کی علمی و سیاسی سرگرمیوں اور "الہلال" سے قلبی لگاؤ تھا۔ "الہلال" کے ۲۳۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں برکت علی کا پہلا مضمون شائع ہوا، اس وقت وہ قصور میں تھے۔ مضمون کا دوہرا عنوان تھا۔ "صدائے ملت---- الہلال کی دعوت کی نسبت" مضمون نگار کا نام اس طرح مرقوم تھا۔ "جناب مولوی برکت علی صاحب بی اے از قصور ضلع لاہور۔"

انھی دنوں مولانا آزاد نے ان کو کلکتے بلا لیا اور وہ "الہلال" میں خدمات انجام دینے لگے۔ اب وہ برکت علی کے بجائے محی الدین احمد قصوری ہو گئے تھے اور پھر انھوں نے اسی نام سے شہرت پائی اور ہم انھیں اسی نام سے جانتے ہیں۔ آئندہ سطور میں ان کا ذکر اسی نام سے ہو گا۔

کلکتے میں مولانا محی الدین احمد قصوری "الہلال" میں بھی کام کرتے تھے اور اس کے ساتھ انھوں نے وہاں سے اپنا ایک روزنامہ اخبار "اقدام" جاری کر لیا تھا۔ یہ اخبار ۱۶-۱۹۱۵ء میں کم و بیش دو سال جاری رہا۔ مولانا آزاد اس کے نگران تھے اور یہ بہت اچھا اخبار تھا۔

۲۳۔ مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومتِ بنگال نے مولانا آزاد کو ایک ہفتے کے اندر حدودِ بنگال سے باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ وہ ۳۰۔ مارچ کو کلکتے سے نکلے۔ پنجاب اور یوپی وغیرہ کی حکومتیں پہلے ہی اپنے ہاں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے چکی تھیں، اس لیے بنگال سے نکل کر انھیں صوبہ بہار میں رانچی کے باہر ایک گاؤں "مورا بادی" میں پناہ لینا پڑی۔ تین ماہ بعد ۸۔ جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومت نے وہیں رانچی میں ان کی نظر بندی کے احکام جاری کر دیئے تھے۔ مولانا تین سال وہاں نظر بند رہے۔

مولانا کے کلکتے سے نکل جانے اور رانچی میں نظر بند ہو جانے کے بعد مولانا محی الدین، قصور چلے گئے تھے۔ مولانا آزاد نے اپنی مشہور تصنیف "تذکرہ" رانچی کی نظر بندی کے

زمانے میں لکھی تھی۔ یہ کتاب جون ۱۹۱۴ء سے ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء کے درمیانی عرصے (یعنی صرف پانچ مہینے) میں قلم بند کر لی گئی تھی۔

کتاب مکمل ہو چکی تھی کہ ۱۹۱۶ (غالباً اکتوبر کے مہینے) میں مولانا محی الدین احمد کو بھی قصور سے گرفتار کر لیا گیا تھا اور گرفتاری کے بعد قصور سے کم و بیش ڈیڑھ سو میل دور ضلع ہوشیار پور کے ایک مقام "دسوہہ" میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ وہ ۱۹۱۹ء تک تین سال وہاں نظر بند رہے۔ مولانا آزاد اس کا "تذکرہ" کے آخر میں ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔

"یہاں تک لکھ چکا تھا کہ ڈاک ملی اور اخبارات سے معلوم ہوا کہ عزیزی مولوی محی الدین احمد بی اے کو قصور میں تلاشی کے بعد گرفتار کیا گیا ہے۔ شاید نظر بندی کا معاملہ پیش آئے۔ ان تمام ایام جلاوطنی میں یہ پہلا دن ہے کہ اس واقعہ کے سننے سے دل کو مضطر اور دماغ کو پراگندہ پاتا ہوں۔

در دمے کیں نامہ می کردم رقم

کان یجرالدمع ممز و جاً بدم

عزیز موصوف بلکہ ان کا پورا خاندان اپنے خصائص ایمانی و جوش اسلامی و ایثار للہ و فی اللہ کے اعتبار سے عہد سلف کے واقعات زندہ کرنے والا ہے اور علی الخصوص اس عزیز کے طلب صادق اور استعدادِ کامل سے تو اپنی چند در چند اُمیدیں وابستہ تھیں۔ افسوس فتنۂ حوادث نے اس کو بھی نہ چھوڑا۔ مجھے اس سے کب انکار تھا کہ میرے پاؤں میں ایک کے بدلے دس زنجیریں ڈال دی جائیں، لیکن دوسروں کو اس میں کیوں شریک کیا جاتا ہے؟ بظاہر عزیز موصوف کا اس کے سوا کوئی جرم نہیں کہ مجھ خانماں خراب سے رسم و راہ رکھتے ہیں۔ سبحان اللہ! اپنی آشنا پروری اور دوست نوازی بھی قابل تماشا ہے، جب تک کوئی اپنا دشمن نہ بن جائے، ہمارا دوست ہی نہیں ہو سکتا۔

اے ہم نفساں! آتشم از من بگریزید
ہر کس کہ شود ہم رہِ ما دشمنِ خویش است

پرسوں ایک عزیز کو خط لکھتے ہوئے یہ رباعی ذہن میں آئی تھی۔

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی
اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
مے خانہ نے رنگ روپ بدلا ایسا
مے کش، مے کش رہا، نہ ساقی، ساقی

فصبر جمیل عسی اللہ ان یاتینی بھم جمیعاً انہ ہوالعلیم الحکیم۔"

"تذکرہ" کے ان الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ مولانا محی الدین احمد قصوری پر مولانا آزاد کس درجے شفقت فرماتے اور ان سے کتنی توقعات رکھتے تھے۔

دسوہہ کی نظر بندی ختم ہونے کے بعد وہ قصور آئے تو چند روز کے بعد ان کو اور ان کے والد مولانا عبدالقادر قصوری کو گرفتار کر کے قصور جیل میں بند کر دیا گیا۔ کافی عرصہ دونوں باپ بیٹا قصور جیل خانے میں محبوس رہے، ان دنوں پنجاب کا گورنر سر مائیکل اوڈوائر تھا۔ وہ بڑا ظالم شخص تھا۔ یوں تو اسے ملک کے تمام آزادی خواہ لوگوں سے دشمنی تھی، لیکن پنجاب کے قصوری خاندان سے اس کو بالخصوص عداوت پیدا ہو گئی تھی اور اس خاندان کے لیے وہ ہر قسم کی سختی اور ظلم کو ضروری قرار دیتا تھا۔ مولانا محی الدین کا تعلق چوں کہ مولانا آزاد سے تھا، اس لیے اس کے نزدیک وہ زیادہ قابلِ عتاب تھے۔

قصور جیل سے رہائی کے بعد مولانا محی الدین ۱۹۲۶ء تک اسلام کی دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہے اور اس سلسلے میں چند کتابیں بھی تصنیف کیں جو مختلف اوقات میں شائع ہوئیں۔ پھر مدراس، احمد آباد، پونا اور بمبئی وغیرہ میں تجارت کرنے لگے۔ جنوبی ہند کے ایک مقام مالابار میں یتیم خانہ قائم کیا جو اب تک موجود ہے۔ اسی اثنا میں تفسیر سورہ فاتحہ اور

تفسیر سورہ یوسف مکمل کی۔ تفسیر سورہ فاتحہ چھپ چکی ہے، لیکن تفسیر سورہ یوسف ابھی تک نہیں چھپی۔

میں نے مولانا محی الدین احمد قصوری کو آزادی وطن سے کئی سال پہلے دیکھا تھا۔ وہ اور ان کے چچا مولانا عبداللہ بی اے قصوری ہمارے شیر کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) میں انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسے میں تشریف لے گئے تھے اور دونوں نے تقریریں بھی کی تھیں۔

آزادی کے بعد میں لاہور آیا تو مولانا محی الدین سے تعلقات استوار ہوئے، میں ان سے نہایت نیازمندانہ انداز میں ملتا تھا اور وہ مجھ پر انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ درمیانہ سا قد، متناسب جسم، شلوار قمیض اور شیروانی میں ملبوس، سر پر قراقلی ٹوپی، نکھرا ہوا رنگ، متعدل سی داڑھی، خوش طبع، زبان میں مٹھاس، چہرے پر متانت نمایاں اور مزاج میں شگفتگی۔ مہمان نواز اور بلند اخلاق۔ عربی کے عالم، فارسی میں عبور اور انگریزی کے ماہر اور بہت اچھے مترجم۔! قرآن مجید پر بڑا استحضار تھا، گفتگو میں کثرت سے برمحل آیات قرآنی پڑھتے اور مضامین میں بھی مناسب مواقع پر قرآن کی آیات تحریر فرماتے تھے۔

وسیع النظر اور کھلے ذہن کے عالم دین تھے۔ تنگ نظری اور یبوست و عبوست سے کہنا چاہیے کہ آشنا ہی نہ تھے۔ عورتوں کی آزادی کے حامی تھے اور ان کو قدیم وجدید تعلیم دلانا ان کے نزدیک ضروری تھا، چہرے کے پردے کے قائل نہ تھے۔ اس موضوع پر میرے دورِ ادارت میں ان کے چند مضامین بھی "الاعتصام" میں شائع ہوئے اور بعض حضرات نے اس باب میں ان سے اختلاف کیا اور جواب میں مضمون لکھے، وہ بھی "الاعتصام: میں چھپے۔

کوئی بات ان کی تحقیق اور مزاج کے خلاف کی جاتی تو عام طور پر پہلے تو سن کر بھڑک اُٹھتے، پھر ایک دم نرم پڑ جاتے اور دوسرے کا نقطہ نظر سمجھنے کی کوشش فرماتے۔ مولانا داؤد غزنوی، مولانا حنیف ندوی، مولانا غلام رسول مہر اور دیگر بہت سے اصحاب علم سے ان کے گہرے روابط تھے اور بعض مسائل پر ان سے گھنٹوں سلسلہ گفتگو جاری رہتا تھا۔

میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، وہ بھی ازراہِ کرم یاد فرماتے۔ جس زمانے میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی ادارت میرے ذمے تھی، اس زمانے میں تیسرے چوتھے دن ان سے ملاقات کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آتی تھی۔

حلقۂ علما میں ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ان کی باتیں توجہ سے سنی جاتی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے واقعات وہ بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔

ایک دن انھوں نے بتایا کہ جس زمانے میں وہ کلکتے میں مولانا آزاد کے پاس مقیم تھے اور ''الہلال'' یا ''اقدام'' میں کام کرتے تھے، کوئی مضمون لکھ کر مولانا کو دکھاتے تو مولانا خوش ہوتے اور کہیں کہیں بعض الفاظ اس طرح بدل دیتے کہ مضمون میں جان پڑجاتی۔

وہ فرمایا کرتے تھے کہ اخبار کے عملے کے ساتھ مولانا نہایت حسنِ سلوک سے پیش آتے تھے اور کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے۔ بقول ان کے مولانا آزاد اپنی کسی ضرورت یا مالی تنگ دستی کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرتے تھے۔ ان کی بات چیت اور میل جُول سے بھی اس کا پتا نہیں چلتا تھا۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار کبھی دکھائی نہیں دیے۔

مولانا آزاد کے اس قسم کے حالات کا تذکرہ وہ بڑی عقیدت اور محبت سے کیا کرتے تھے۔

مولانا محی الدین اپنے اسلاف کے تمام اوصافِ حمیدہ سے موصوف تھے۔ نہایت ہمدرد اور رحم دل، زہد و تقویٰ کا خوب صورت پیکر، اسلام کی دعوت و تبلیغ میں بڑے تیز اور قرآن سے انتہائی لگن۔ وہ مزنگ روڈ کی کوٹھی ۵۴ میں سکونت پذیر تھے۔ کوٹھی کے برآمدے میں ایک تخت پوش پڑا ہوتا تھا، جس کے اوپر صاف ستھرا کپڑا بچھا رہتا تھا۔ مولانا موصوف اس پر بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ گرمیوں میں عام طور پر شام کے وقت تخت پوش صحن میں رکھ لیا جاتا تھا۔ ان کا تحریر و مطالعہ کا کمرہ جسے ان کا دفتر کہنا چاہیے کوٹھی کے برآمدے کے ایک سرے پر تھا، مگر بعض اوقات وہ تخت پوش پر بیٹھے ہی لکھتے پڑھتے

رہتے تھے۔

انھوں نے کتنی ہی یتیم اور بے سہارا بچیوں کو اپنے گھر میں رکھا، ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور پھر اپنی بیٹیوں کی طرح اچھی جگہ ان کی شادی کی۔

دینی حلقوں میں ان کو خاص قدر و منزلت حاصل تھی۔ وہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلسِ عاملہ کے رکن تھے اور جمعیت کے فیصلوں میں ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔

اپریل ۱۹۶۵ء میں مرکزی جمعیت کی آٹھویں سالانہ کانفرنس سیالکوٹ میں ہوئی تھی، جس کی صدارت مولانا موصوف نے فرمائی تھی اور ان کا تحریری خطبہ صدارت ملک و قوم کے بہت سے اہم مسائل پر محیط تھا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ عمر کی ۶۷ منزلیں طے کر چکے تھے، ۱۹۲۶ء میں ان کی عمر ۳۶ / ۳۷ سال کی تھی۔ اس زمانے میں انھوں نے جنوبی ہند میں مالابار کے مقام پر بہت بڑا یتیم خانہ قائم کیا تھا، جس میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ بھی جاری کیا گیا تھا۔ اس نواح میں دعوت اسلام کے لیے انھوں نے پونا کو اپنا مرکز بنایا تھا۔ اس کے تمام اخراجات وہ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔

اندازہ کیجیے قصور سے چل کر کہاں پہنچے تھے اور دعوتِ اسلام کا جذبۂ صادقہ انھیں اپنے وطن سے کتنے سو میل دور لے گیا تھا۔ اس علاقے میں تھوڑے ہی عرصے میں ان کی دعوت سے بارہ ہزار غیر مسلمان دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اللہ اللہ! کس درجے مخلص اور صاف نیت تھے یہ لوگ اور اسلام کے کس قدر گرویدہ۔!!

ستمبر ۱۹۵۶ء میں خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے مولانا موصوف سے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہونے کی درخواست کی تھی اور طے پایا تھا کہ سب سے پہلے ادارے کی طرف سے ان کی تفسیر سورہ یوسف شائع کی جائے گی، جسے وہ مکمل کر چکے تھے۔ یہ بات ابھی چل ہی رہی تھی کہ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں مولانا داؤد غزنوی کی تجویز سے انھیں جماعتِ اہل حدیث کے مدارس کا ناظم تعلیمات مقرر کر دیا گیا، جس کی وجہ سے وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ نہ ہو سکے۔

مولانا محی الدین کبھی کبھی گزشتہ دور کی بہت سی باتیں سنایا کرتے تھے۔ اب کوئی ایسا شخص نہ ان کے خاندان میں باقی رہا ہے، نہ ان کے جاننے والوں میں کہیں دکھائی دیتا ہے جو اس قسم کی باتوں سے باخبر ہو یا ان سے دلچسپی رکھتا ہو۔

انھوں نے بتایا کہ ۱۹۲۶ء میں جب ان کے والد مولانا عبد القادر نے سلطان عبد العزیز ابن عبد الرحمان آل سعود کی دعوت پر مکہ معظمہ کی مؤتمر میں شرکت کی تھی، تو سلطان ان سے نہایت اعزاز سے پیش آیا تھا۔ ایک موقع پر اس نے مولانا عبد القادر سے کہا کہ مجھے کچھ نصیحت کیجیے۔

مولانا نے فرمایا لوگوں کی خدمت کو اپنا معمول بنا لو اور اس کے لیے خود ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرو۔ جتنی زیادہ خدمت کرو گے، اتنا ہی مستحق تکریم قرار پاؤ گے۔

سلطان نے کہا میں بہت بھاگ دوڑ کرتا ہوں اور خود لوگوں کے پاس پہنچ کر براہِ راست ان کے حالات و ضروریات سے آگاہی حاصل کرتا ہوں۔ پھر اس نے مولانا کو اپنے پاؤں دکھائے اور کہا کہ بھاگ دوڑ میں میرے پاؤں پھٹ گئے ہیں۔

مولانا نے کہا: سلطانِ معظم! میری بات یاد رکھیے، جب تک آپ کے پاؤں پھٹے رہیں گے اور ان میں بوائیاں موجود رہیں گی آپ لوگوں کے خادم تصور کیے جائیں گے، جب پاؤں کے زخم مندمل ہو جائیں گے اور ان میں سختی کے بجائے نرمی آجائے گی، آپ کی سعی و کوشش کا سلسلہ نرم پڑ جائے گا۔

سطان یہ جواب سن کر نہایت خوش ہوا۔ اس نے کہا کہ یا تو آپ خود یہاں رہ جائیے یا اپنے دو بیٹوں (محی الدین اور محمد علی) میں سے ایک مجھے دے دیجیے۔

مولانا نے فرمایا: نہ میں خود یہاں رہ سکتا ہوں اور نہ اپنے بیٹوں میں سے کسی کو یہاں چھوڑ سکتا ہوں۔ میں بھی اپنے ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں اور میرے بیٹوں کی بھی یہاں کے بجائے ہندوستان میں زیادہ ضرورت ہے۔

کیا اب کوئی ایسا دلیر اور صاف گو آدمی ہے جو کسی حکمران کو یا چھوٹے بڑے اہل کار

ہی کو اس قسم کی بات کہہ سکے؟ یا کسی بااختیار بادشاہ اور صاحبِ اقتدار کی پیش کش کو ٹھکرا سکے؟ ہر شخص اس نوع کی پیش کش کو اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھتا اور قابلِ فخر قرار دیتا ہے اور نہایت مسرت کے ساتھ اسے قبول کرتا ہے، لیکن مولانا عبدالقادر قصوری اس پر اپنے وطن کی خدمت کو ترجیح دیتے ہیں۔

ایک دن انھوں نے بتایا کہ جب وہ گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کرتے تھے، جمعے کے روز امرتسر چلے جاتے تھے اور وہاں مولانا داؤد غزنوی کے والدِ گرامی مولانا عبدالجبار غزنوی کی مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھتے تھے۔ مولانا عبدالجبار کو انھوں نے بتا دیا تھا کہ وہ مولانا عبدالقادر قصوری کے بیٹے ہیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بھی کچھ عرصہ ان کا یہی معمول رہا کہ جمعے کی صبح کو امرتسر پہنچ گئے، مولانا عبدالجبار غزنوی کی اقتدا میں جمعہ پڑھا، ان کو سلام کرکے دعا کی درخواست کی اور شام کو واپس آگئے۔

اس کے بعد کسی مجبوری کی بنا پر تین چار جمعے وہ امرتسر نہیں جاسکے۔ ایک دن اچانک مولانا عبدالجبار غزنوی قصور ان کے گھر پہنچ گئے۔ بقول مولانا محی الدین کے وہ اباجی سے ملے اور اباجی انھیں دیکھ کر نہایت حیران ہوئے۔

پوچھا: مولوی محی الدین کہاں ہیں؟ کئی جمعے گزر گئے، وہ امرتسر نہیں گئے، تندرست تو ہیں، میں ان کا پتا کرنے آیا ہوں۔

مولانا محی الدین نے بتایا کہ اباجی نے مجھے اطلاع دی، میں حاضر ہوا تو پوچھا: مولوی محی الدین آپ کا کیا حال ہے؟

مولانا محی الدین فرماتے ہیں، میں اتنے بڑے متقی عالم دین کی تشریف آوری سے نہایت متاثر ہوا۔ انھوں نے صرف میرے لیے امرتسر سے قصور آنے کی تکلیف کی تھی۔

مولانا عبدالقادر قصوری اور ان کے صاحب زادوں نے برصغیر کی سیاست میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا اور اس سلسلے میں ان کی تگ و تاز کی حدود بڑی وسیع تھیں۔ انھوں نے چمرقند کے مجاہدین کی اس تحریک میں بھی کام کیا جو سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل دہلوی

کی شہادت (مئی ۱۸۳۱) سے لے کر آزادی وطن (اگست ۱۹۴۷) تک تقریباً ایک سو سولہ سال جاری رہی۔ برصغیر کی آزادی اور اس خطے میں اسلامی خدمت کی یہ واحد تحریک تھی جس نے اتنی طویل عمر پائی اور جو بغیر کسی وقفے کے ایک خاص رفتار کے ساتھ اپنا سفر طے کرتی رہی۔ اس میں تمام تر وہ مذہبی لوگ شامل تھے جنھیں حکمرانی یا اقتدار کا ہرگز کوئی لالچ نہ تھا۔ اس کی مناسب تفصیل انشاء اللہ اس مضمون میں بیان کی جائے گی جو مولانا محی الدین احمد قصوری کے چھوٹے بھائی مولانا محمد علی قصوری (ایم اے کینٹب) کے بارے میں لکھا جائے گا۔

مولانا محی الدین نے ایک مرتبہ بتایا کہ ابا جی (یعنی مولانا عبدالقادر) نے قصور آ کر وکالت شروع کی تو ان کے والد "دلاور چیمہ" سے بیٹے کی ملاقات کو آئے۔ بیٹے نے والد کو ایک چھوٹا سا چاقو دکھایا جو جرمنی کا بنا ہوا تھا اور چند روز پہلے ہندوستان آیا تھا۔ کہا یہ بہت اچھا چاقو ہے اور اس کی قیمت چھ آنے ہے، اس سے جتنے جی چاہے قلم بنا لیں، یہ خراب نہیں ہوتا۔ اس زمانے میں سرکنڈے یا کلک کے قلم چلتے تھے۔

باپ نے بیٹے کی بات سنی تو کہا: تم نے جرمنی کا بنا ہوا چھ آنے کا چاقو خریدتے وقت یہ نہ سوچا کہ وزیر آباد کا بنا ہوا ایک آنے کا چاقو کون خریدے گا؟ دونوں سے قلم بنائے جا سکتے ہیں، ایک آنے والے سے بھی اور چھ آنے والے سے بھی۔ وزیر آباد کے چھ آنے میں چھ چاقو آتے ہیں۔

مولانا محی الدین فرماتے ہیں اس کے بعد ابا جی نے نہ صرف یہ کہ کبھی ولایتی چاقو نہیں خریدا بلکہ کوئی بھی ولایتی چیز نہیں خریدی۔ اپنے ملنے والوں کو بھی وہ ولایتی اور انگریزی چیزیں خریدنے سے منع کرتے اور دیسی چیزیں خریدنے اور استعمال کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔

مولانا محی الدین کے بارے میں یہاں ایک ذاتی واقعہ بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

۱۹۵۸ء کی بات ہے میں نے مولانا موصوف سے پچاس روپے بطور قرض لیے۔ پچاس

روپے اس زمانے میں اچھی خاصی رقم تھی۔

آٹھ دس روز کے بعد واپس کرنے گیا تو کہا: میں نے تمھیں پچاس روپے دیے ہی نہیں، وصول کیوں کروں۔

میں نے تفصیل عرض کی تو فرمایا:

ہمارے والد صاحب ہمیں کہا کرتے تھے کہ اگر تم سے کوئی اتنے پیسے بصورتِ قرض لے جو تم آسانی سے دے سکو تو اسے بھول جاؤ اور وصولی کا خیال ذہن سے نکال دو۔ چنانچہ میں بھول گیا ہوں اور وصولی کا خیال ذہن سے نکال دیا ہے۔

میرے اصرار کے باوجود انھوں نے پچاس روپے وصول نہیں کیے۔

ایک بات اور سنیے۔

ایک مرتبہ ہم دونوں کسی سفر پر گئے۔ لاہور سے بس پر سوار ہوئے تو میں نے دونوں کا کرایہ دینے کے لیے جیب سے پیسے نکالے۔ انھوں نے مسکراہٹ آمیز لہجے میں مجھے ڈانٹا اور کہا: جب اپنے سے بڑے کے ساتھ سفر پر جاؤ تو آرام سے بیٹھے رہو، کرایہ دینے کی کوشش نہ کرو۔ بڑے کا فرض ہے وہ چھوٹے کا کرایہ ادا کرے۔

میرے وہ بڑے کرم فرما تھے۔ میں بھی اکثر ان کے دولت کدے پر حاضری دیتا تھا، وہ بھی کبھی فقیر کی کٹیا پر تشریف لے آتے تھے۔ وہ بالالتزام تہجد پڑھتے اور عام نمازوں کے بعد لمبی دعا کرتے تھے۔ وظائف و اوراد سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ بعض معاملات سے متعلق تعویذ بھی دیتے تھے اور تعویذ کا اثر بھی ہوتا تھا۔ مجھے بھی ایک معاملے میں انھوں نے کئی دفعہ کہا کہ میں ان سے تعویذ لوں، اللہ کرم کرے گا۔

تعویذ کے لیے ان کی شرط یہ تھی کہ میں سائل کی حیثیت سے ان کی خدمت میں حاضری دوں اور آتے ہی اصل مدعا بیان کروں۔

افسوس ہے میں ان سے تعویذ نہ لے سکا۔

سعودی عرب کے حکمران سلطان عبدالعزیز کے بارے میں گزشتہ سطور میں بتایا جاچکا

ہے کہ وہ مولانا عبدالقادر قصوری کا کس قدر احترام کرتے تھے، اس کا سلطان موصوف کے بڑے بیٹے سلطان سعود کو علم تھا، چنانچہ وہ اپریل ۱۹۵۴ء میں پاکستان کے دورے پر آئے تو سعودی عرب کے سفیر متعینہ پاکستان نے لاہور کے جن حضرات کو سلطان سعود کے استقبال اور ملاقات کے لیے کراچی آنے کی دعوت دی، ان میں مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا محمد علی قصوری، اور مولانا داؤد غزنوی شامل تھے - یہ حضرات کراچی گئے اور سلطان سعود سے ملے۔ سلطان نے ان کو خاص طور سے ملاقات کا وقت دیا اور دیر تک ان سے مصروف گفتگو رہے۔

مولانا محی الدین اپنے ماضی کے اوراق کھولتے تو ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا ورق الٹتے چلے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ بتایا کہ بی اے پاس کر لینے کے بعد ان کے والد انھیں وکیل بنانا چاہتے تھے، لیکن ان کا ذہن وکالت کی طرف مائل نہیں ہو رہا تھا، وہ تحریر ونگارش سے دلچسپی رکھتے تھے اور اپنا اخبار جاری کرنا چاہتے تھے۔ جب والد کا اصرار بڑھا تو انھوں نے کہا: یہ دیوانِ حافظ پڑا ہے، حافظ سے پوچھ لیتے ہیں۔

دیوان کھولا تو پہلا شعر ہی یہ نکلا کہ جو کام باپ کرتا ہے بیٹا وہ کام نہ کرے۔

اس کے بعد وکالت کا خیال ترک کر دیا گیا اور وہ مولانا آزاد کے پاس کلکتے چلے گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے ستائیس مکتوبات مولانا محی الدین قصوری کے پاس تھے جو انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف معاملات سے متعلق مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا محی الدین قصوری کے نام تحریر فرمائے تھے۔ یہ مکتوبات انھوں نے "تبرک" سمجھ کر نہایت احتیاط سے ایک فائل میں محفوظ رکھے تھے۔ کبھی کبھی مکتوبات کا یہ مجموعہ وہ مجھے دکھایا کرتے تھے اور ہر مکتوب کا پس منظر بھی بیان فرمایا کرتے تھے۔ ایک مکتوب کی گم شدگی کا انھیں نہایت افسوس تھا۔

انھوں نے ایک مرتبہ سورہ ملک کے بعض مطالب کے متعلق مولانا آزاد سے چند سوالات کیے تھے۔ مولانا نے جواب میں اس سورت کی پوری تفسیر لکھ کر ارسال فرما دی تھی

جو چالیس صفحات پر محیط تھی۔

مولانا محی الدین نے بتایا کہ وہ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں پولیس عام طور پر ان کے مکان کی تلاشی لیتی رہتی تھی۔ تلاشی کے دوران بعض کاغذات اکٹھے کر کے لے جاتی تھی جو ہمارے نزدیک نہایت اہم ہوتے تھے لیکن پولیس کو ان کی اہمیت کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ کاغذات واپس نہیں کیے جاتے تھے اور ضائع ہو جاتے تھے۔

اس خطرے کے پیش نظر ان کی اہلیہ محترمہ نے ایک دن بہت سے کاغذات اکٹھے کر کے مکان کی چھت پر پھینک دیئے، ان کاغذات میں سورہ ملک کی وہ تفسیر بھی تھی جو چالیس صفحات کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ تیسرے چوتھے دن چھت پر جا کر دیکھا تو تمام کاغذات ہوا کے جھونکوں کی نذر ہو چکے تھے اور اب سوائے افسوس کے کوئی چارہ نہ تھا۔

مولانا محی الدین بڑے با حمیت اور اصول پسند تھے۔ کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف ہوتی تو اس کا نوٹس لیتے، اس کی بالکل پروا نہ کرتے کہ سامنے کتنا بڑا آدمی کھڑا ہے۔ ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی اپنی اس اصول پسندی اور حمیت کا پوری جرأت سے احساس دلا دیا تھا۔

انھوں نے مولانا آزاد سے کچھ استفسارات کیے تھے، مولانا کے پاس اتفاق سے اس وقت کوئی کاغذ نہیں تھا، انھوں نے اسی خط پر جواب تحریر فرما دیا۔ مولانا محی الدین نے اس پر اپنے انداز میں خفگی کا اظہار فرمایا اور اسے مولانا کی طرف سے اپنے لیے "تغافل" پر محمول کیا۔ مولانا آزاد کو جواب میں معذرت کرنا پڑی اور آئندہ ایسا کرنے سے بچنے کا وعدہ کیا اور لکھا:

> "آپ نے میرے تغافل کی شکایت کی ہے۔ تغافل کا تو اقرار نہیں کر سکتا لیکن اس میں شک نہیں کہ جب کبھی میں نے آپ کے اور اپنے معاملے میں غور کیا ہے، یقین کیجیے کہ ہمیشہ خود میرے قلب نے مجھے ملامت کی ہے۔ آپ کی محبتوں کا میری جانب سے عشر عشیر بھی حق ادا

نہ ہوا۔ میں خود اس کا معترف ہوں اور متمنی ہوں کہ کاش بقیہ زندگی میں کچھ تلافی کرسکوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ محبت کی کوتاہیاں حدِ تلافی ومکافات سے مافوق ہیں۔ میری کوتاہی کی تلافی ہوسکتی ہے، لیکن محبت کی کوتاہی کی تلافی ممکن نہیں۔ مجھ سے علاقہ رکھنے والوں میں صرف ایک شخص ہے جس نے غالباً آپ سے بھی زیادہ مصائب برداشت کیے۔ باقی اور سبھوں سے زیادہ آپ کے لیے اپنے اندر اندوہ وغم پاتا ہوں اور دائمی اضطراب رکھتا ہوں۔

الی اللہ اشکو، ان فی النفس حاجۃ

تمر بہا الا یام ھی کما ھیا

خط کی پشت پر تحریر جواب کو بھی آپ نے من جملہ شواہد تغافل کے قرار دیا، حالاں کہ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ اس وقت سوئے اتفاق سے کاغذ موجود نہ تھا۔ آئندہ اس سے احتراز کروں گا۔"

یہ معلوم نہ ہوسکا کہ دوسرا کون شخص تھا جس نے مولانا آزاد کے لیے مولانا محی الدین احمد قصوری سے "بھی زیادہ مصائب برداشت کیے۔"

میں نے مولانا محی الدین کے پاس یہ خط دیکھا تھا۔ اب یہ مولانا غلام رسول مہر کی کتاب "تبرکاتِ آزاد" میں چھپ گیا ہے۔

مولانا آزاد نے ۲۲۔ فروری ۱۹۵۸ء کو وفات پائی۔ اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا محی الدین نے اس عاجز کو یاد فرمایا اور ہم دونوں مولانا آزاد کے مکتوباتِ گرامی کا مجموعہ مولانا غلام رسول مہر کے پاس لے کر گئے۔ اس سے قبل مولانا آزاد کے مکاتیب کا وہ مجموعہ جو مولانا غلام رسول مہر کے نام تھا "نقشِ آزاد" کے نام سے چھپ چکا تھا۔

مولانا محی الدین کے نام مولانا آزاد کے زیادہ تر مکتوبات علمی نوعیت کے تھے جو کسی نہ کسی علمی سوال کے جواب میں تحریر فرمائے گئے تھے۔ مکتوبات کا یہ مجموعہ "تبرکاتِ آزاد" کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔

مولانا محی الدین احمد قصوری نے بیاسی سال عمر پا کر ۲۴- جنوری ۱۹۷۱ (۲۶- ذیقعدہ ۱۳۹۰ھ) کو اتوار کے دن صبح چار بجے لاہور میں وفات پائی اور انھیں قصور میں دفن کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس خاندان کی وہ مذہبی اور اصلاحی روایات ختم ہو گئیں جو اس کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔

اللهم اغفرله و ارحمه و عافه واعف عنه-

مولانا مرحوم نے اپنے پیچھے چار بیٹیاں اور چار بیٹے چھوڑے۔ ان کے ایک بیٹے معین الدین احمد قریشی ہیں جو آج پاکستان کے وزیر اعظم ہیں۔